اسلام اور حقوق بشر

قائد ملت مولانا سید کلب جواد نقوی، جنرل سکریٹری مجلس علماء ہند

(۱)

دنیائے مغرب نے بڑی آب وتاب کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کررکھا ہے کہ انسانی حقوق کے موجد، مبلغ اور محافظ مغربی مفکرین رہے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ادیان الٰہی خاص طور سے شریعت مصطفوی میں انسانی حقوق کا کتنا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ انسانی حقوق کے مبلغ اور محافظ ہمیشہ سے انبیاء و مرسلینؑ اور رہبران مذہبی ہی رہے ہیں، پردۂ خفا میں چلی گئی ہے۔

دراصل پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد حقوق انسانی کی طرف توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی، کیوں کہ ان دونوں جنگوں کے دوران ظلم وستم، وحشت اور بربریت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مار دیا گیا تھا، لہٰذا انسانی حقوق کی توضیح وتشریح اوران کی حفاظت کی سخت ضرورت محسوس کی گئی۔ اگرچہ کافی زمانہ سے حقوق بشر موضوع گفتگو رہے ہیں، جیسے کہ ۱۶۸۸ء میں پارلیمان برطانیہ میں انسانی حقوق کا ایک منشور منظور ہوا۔ اسی طرح سے امریکہ میں بھی ۱۷۷۶ء میں انسانی حقوق کا بل منظور کیا گیا، مگر بات صرف کاغذ تک محدود رہی۔ آج یوروپ والے فخر کررہے ہیں کہ انہوں نے اقوام متحدہ میں ۱۹۴۸ء میں حقوق انسانی کا منشور منظور کروایا اور دنیا کے ستم رسیدہ اور ظلم زدہ انسانوں کو ایک عظیم تحفہ دیا۔ یقیناً یورپ والوں کے لئے کھلے منشور حقوق انسانی ایک نئی اور قابل فخر بات ہوسکتی ہے، کیوں کہ یوروپ کی تاریخ مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم سے بھری ہوئی ہے۔ جوان عورتوں کو جادوگرنی ہونے کے بہانے سے پادریوں کے ذریعہ زندہ جلوا دیا گیا اور پتہ نہیں کتنے علماء اور سائنسدانوں کو عیسائی معتقدات اور مسلمات کی مخالفت کی سزا میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ وہاں نہ انسانوں کو بحیثیت انسان کوئی عزت حاصل تھی اور نہ عورت کی شرافت اور عصمت کی کوئی قیمت تھی اور نہ آزادی کے صحیح مفہوم سے کوئی واقف تھا۔ ایسے معاشرہ میں انسانی حقوق کے لئے آواز اٹھانا اور انسانیت کی حفاظت کی بات کرنا یقیناً خود ان کے لئے باعث افتخار ہے، مگر مسلمانوں کے لئے یہ تمام باتیں نئی نہیں ہیں، کیوں کہ اسلام چودہ سو سال قبل ہی یہ سارے حقوق ان سے کہیں بہتر انداز میں دنیائے انسانیت کو عطا کرچکا ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مغربی مفکرین نے حقوق انسانی کا تصور اسلام ہی سے لیا ہے، کیوں کہ اسپین میں مسلمانوں کے قبضہ کے بعد یوروپ تک سارے علوم مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچے ہیں۔ اگرچہ عیسائی مورخین اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے ہیں۔

انسانی حقوق پر گفتگو سے پہلے اس حقیقت کو تسلیم کرنا بہت ضروری ہے کہ انسان کی عقل ہر کام کی مصلحت، مفسدہ، نقصان وفائدہ مکمل طریقے سے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اگر عقل انسانی کافی ہوتی تو انبیاء ورسلؑ کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں تشریع مطابق تکوین ہے، یعنی اسلامی احکام مطابق فطرت ہیں اور شریعت اسلامیہ انسان کی فطرت اور طبیعت پر مبنی ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کو وہی سمجھ سکتا ہے، جو خالق فطرت ہے اور تیسرا امر جو احکام اسلامیہ کے سلسلہ میں ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ انسان کا ہدف اصلی اور منزل

واقعی آخرت ہے۔ انسان پیدا ہی ہوا ہے آخرت کے لئے، لہٰذا اسلام کا کوئی بھی حکم ایسا نہیں ہے کہ جس میں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت مدنظر نہ ہو، اس لئے بہت سے اسلامی احکام کی مصلحت ہم انسان سمجھنے سے قاصر ہیں اور مصلحت اخروی کا علم صرف اور صرف ہمارا خالق رکھتا ہے اور یہ ہماری عقلِ واحد تک سے بالاتر ہے۔ دنیا کی زندگی صرف مقدمہ ہے، آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کا۔ اقوام متحدہ کے منشور میں سارے حقوق کا محور انسان بحیثیت انسان ہے۔ ایک ایسا انسان جس کا اپنے خالق سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام نے جو حقوق عطا کئے ہیں، ان میں صرف انسان ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے خالق کا بندہ بھی ہے، لہٰذا اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی میں درج انسان، جو خدا سے لاتعلق بھی ہے اور جس کی زندگی، حقوق اور ذمہ داریاں صرف اس دنیا تک محدود ہیں، اس انسان اسلامی سے بنیادی فرق رکھتا ہے، جو اللہ کا مطیع بھی ہے اور جس کے سامنے آخرت کی ہمیشہ کی زندگی بھی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اقوام متحدہ کے منشور میں محور ومرکز انسان ہے اور اسلام میں بھی سارے 'احکام' کا محور وموضوع انسان ہی ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان بذات خود لائق تعظیم اور شائستہ تکریم ہے۔ زمین کے اوپر اس کی حیثیت خلیفۃ اللہ کی سی ہے۔ 'جب تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین کے اوپر اپنا جانشین بنانے والا ہوں' (سورہ بقرہ: ۳۰) انسان کی تخلیق کے موقع پر سارے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ 'جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو' (سورہ بقرہ: ۳۴) پوری کائنات اور ساری مخلوقات کو اس کے لئے مسخر فرمادیا۔ 'کیا تم لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے اور تمہارے لئے ساری ظاہری وباطنی نعمتوں کو مکمل کردیا ہے۔' انسان کی تخلیق کے بعد خود اپنے کو اللہ تعالیٰ نے احسن الخالقین کا لقب دیا۔ 'فتبارک اللہ احسن الخالقین' (سورہ مومنون: ۱۴)

انسان زمین پر الٰہی نمائندہ ہے اور اس کے صفات وکمالات کا مظہر ہے۔ حق کا اظہار، عدل وانصاف کا قیام، رحمت اور محبت کو عام کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔ قرآن مجید تمام انسانوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، انسانیت اور ذات کے لحاظ سے یکساں سمجھتا ہے۔ انسان کی آزادی اس کے حقوق اور اس کی عزت کا پاس ولحاظ ہے، رنگ ونسل وزبان وغیرہ اسلام کی نگاہ میں ناقابل اعتبار ہیں اور عزت کا معیار صرف تقویٰ قرار دیا ہے۔ اسلام نے اسی نظریہ کے تحت انسان کے لئے حقوق وفرائض متعین کئے ہیں۔ تھوڑی سی تحقیق کے بعد یہ حقیقت روشن وعیاں ہوجاتی ہے کہ اقوام متحدہ منشور حقوق انسانی میں جو کچھ بھی درج ہے، تقریباً وہ تمام امور اسلامی نظام میں پہلے ہی سے بطور اتم واکمل موجود ہیں۔ انسان کے تمام فطری اور طبعی حقوق جیسے حق حیات، حق کرامت وعزت، حق تعلیم وتعلم وتربیت، حق آزادی، حق مساوات، حقوق نسواں وغیرہ تمام بنیادی حقوق اسلام کی توجہ کا مرکز ہیں۔ اس طرح سے اطمینان سے کہا جاسکتا ہے کہ جتنے بھی اصول اقوام متحدہ کے منشور ۱۹۴۸ء میں مندرج ہیں، وہ سب براہ راست دین اسلام سے متاثر ہوکر ترتیب دیئے گئے ہیں اور ان کا سرچشمہ دین الٰہی ہے۔ اسلام اقوام متحدہ کے وجود سے سیکڑوں سال پہلے ہی انسانیت کو سارے حقوق عطا کرچکا ہے۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۲۲؍اکتوبر ۲۰۱۰ء)

(۲)

اس سے قبل عرض کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے منشور حقوق بشر میں مرکزی نقطہ اور محور انسان کی ذاتی عزت، شرافت اور کرامت ہے جس کو منشور میں وراثتی وقار (Inherent diginity) سے یاد کیا گیا ہے۔ انسان کے اسی ذاتی عزت وکرامت کے تصور نے، جو موجودہ زمانہ میں بھی نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے، انسان کے درمیان عادلانہ رشتوں اور ان کے حقوق کے احترام میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر پورا منشور تشکیل دیا گیا اور ساری دنیا میں امن وصلح کا ماحول قائم کرنے اور انسانی

حقوق کے احترام کی اپیل کی گئی ہے۔

انسان کی ذاتی عزت اور شرافت کو ادیان الٰہی، خصوصیت سے اسلام میں اہم مقام حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کے وجود سے بہت پہلے اسلام اعلان کر چکا ہے کہ انسان ذاتی طور پر عزت و احترام کا مستحق ہے، ترجمہ: ہم نے آدم کی اولاد کو عزت عطا کی، (سورہ اسراء: ۷۰) مگر جس طرح اقوام متحدہ کے 'انسان' اور اسلام کے 'انسان' میں فرق ہے (جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے) اسی طرح سے اقوام متحدہ اور اسلام کے مابین کرامت انسانی کے تصور میں بھی فرق ہے۔ منشور اقوام متحدہ میں انسانی عزت و شرافت ثابت وجامد ہے، مگر اسلام میں ذاتی طور پر تعظیم وتکریم کا مستحق انسان اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کی بدولت اس عزت کو کھوکر اپنے کو جانوروں سے بھی پست بنا لیتا ہے۔ ترجمہ: وہ جانوروں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی پست (سورہ اعراف: ۱۷۹) اور یہی انسان اپنے تقوے، نیک اعمال اور اطاعت الٰہیہ کے ذریعہ عزت کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچ سکتا ہے۔ ترجمہ: اللہ کے یہاں تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ باتقویٰ ہے (سورہ حجرات: ۱۳) یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں انسان کی بے اندازہ تعریف و مدح ہے۔ کبھی اعلان ہوتا ہے، ہم نے ان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ (سورہ تین: ۳) کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو خلق فرما کر اپنے کو احسن الخالقین کے لقب سے نوازتا ہے۔ (سورہ مومنون: ۱۴) اسی انسان کو بحیثیت خلیفہ خدا پیش کیا جاتا ہے اور فرشتوں پر برتری عطا کی جاتی ہے (سورہ بقرہ: ۲۳) یہ انسان مسجود ملائکہ قرار پاتا ہے (سورہ بقرہ: ۲۳) اور کائنات کو اس کے سارے خزانوں کے ساتھ، اسی کے لئے مسخر کر دیا جاتا ہے (سورہ انعام: ۱۴۱) مگر اسی کے برعکس قرآن مجید میں سب سے زیادہ مذمت اسی انسان ہی کی ہے۔ کہیں ارشاد ہے، ترجمہ: یہ بے انتہا ستم گر اور نادان ہے۔ (سورہ احزاب: ۲۱) کہیں فرمایا، ترجمہ: اپنے پروردگار کے لئے انتہائی ناشکرا ہے۔ (سورہ حج: ۲۲) کہیں اعلان ہوا، ترجمہ: وہ بہت جلد باز، باغی، مخلوقات میں سب سے زیادہ جھگڑالو، تنگ نظر اور کنجوس ہے۔ یہاں پر مسئلہ تھوڑا الجھ جاتا ہے اور ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا انسان خیر و شر سے مل کر بنا ہے جو ایک ہی وقت میں اس کی تعریف بھی ہے اور مذمت بھی؟ کیا اس کی سرشت میں نور و ظلمت باہم مخلوط ہیں کہ جو بیک وقت مدح بھی ہے اور قدح بھی؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کبھی تعریف اور کبھی مذمت اس سبب سے نہیں ہے کہ انسان کا قوام خیر و شر سے مل کر بنا ہے، بلکہ قرآن مجید اس حقیقت کو سمجھانا چاہتا ہے کہ ہم نے تمام قوتیں انسان کے اندر پوشیدہ کر دی ہیں اور اس کو اختیار دے دیا ہے کہ ان کا استعمال صحیح یا غلط اپنی مرضی سے کرے۔ دوسرے لفظوں میں قدرت نے انسان کو مختلف صفات و کمالات کی صورت بے شمار رنگ مہیا کر دیے تاکہ وہ اپنے کردار کی تصویر خود بنائے، انسان اپنا خود نقاش بھی ہے اور خود اپنا ہی معمار بھی۔ جب اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو صحیح راہ میں استعمال کرے گا تو فرشتوں کو پیچھے چھوڑ دے گا اور اگر انہیں قوتوں کا غلط استعمال کرے گا تو جانوروں سے بھی پست ہوجائے گا۔ روایات اور سیرت پاک محمد وآل محمد علیہم السلام میں بھی کرامت اور شرافت انسان کے سلسلہ میں شدید تاکید ملتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے میدان منیٰ کے اپنے مشہور خطبہ میں ارشاد فرمایا "اے لوگو! آگاہ ہوجاؤ کہ تمہارا پروردگار ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، نہ عرب کو عجم پر برتری حاصل ہے، نہ عجم کو عرب پر، نہ گندمی رنگ والوں کو کالوں پر اور نہ کالوں کو گندمی رنگ والوں پر فوقیت حاصل ہے۔ بنیاد صرف تقویٰ ہے۔" (تفسیر المیزان، ج۱۸ص ۳۳۴) پورا کلام رسالت اقوام متحدہ کے منشور میں موجود انسان کی Inherent Diginity کا بہترین مرقع ہے۔ مولا علیؑ نے اپنے ایک خطبہ میں اسی حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے "اے لوگو! حضرت آدمؑ نہ کسی غلام کو دنیا میں لائے تھے اور نہ کسی کنیز کو۔ تمام انسان آزاد ہیں۔ ہاں مگر بعض کی ذمہ داریاں بعض پر ضرور ڈالی گئی ہیں۔" (کتاب الوافی، ج۱۴ص ۵۳۰) حضرت علی نے اپنے گورنر مالک اشتر کے نام خط میں اس طرح ہدایت فرمائی ہے

’’مہربانی، حسن سلوک اور رحم کے جذبہ کو اپنی رعیت کے لئے اپنے دل میں جگہ دو، کیوں کہ عوام دو گروہ ہیں، یا دین میں تمہارے بھائی ہیں یا خلقت میں تمہارے مانند ہیں‘‘ (نہج البلاغہ، خط نمبر ۵۳) اسلام میں خلقت میں یکسانیت کے جذبہ پر بہت تاکید ہے۔ اپنے افعال واعمال میں مسلمانوں کو اس یکسانیت کے پہلو کی رعایت کا حکم دیا گیا ہے۔ مشہور صحابی جابر بن عبداللہ انصاریؒ سے روایت ہے’’ایک جنازہ لے جایا جارہا تھا۔ رسالتمآبؐ جنازہ کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ ہم سب بھی کھڑے ہوگئے۔ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا ’اے اللہ کے رسولؐ! یہ یہودی کا جنازہ ہے۔‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’جب کسی جنازہ کو دیکھو تو اس کے احترام میں کھڑے ہوجاؤ اور کیا یہودی ایک انسان نہیں ہے؟‘ (صحیح بخاری، ج ا ص ۲۲۸) حضرت علیؑ ایک جگہ سے گذر رہے تھے دیکھا ایک بوڑھا آدمی بھیک مانگ رہا ہے، آپ نے پوچھا: ’یہ کون ہے‘ جواب دیا گیا: ’ایک عیسائی ہے‘، مولا علیؑ نے فرمایا: ’جب اس میں طاقت تھی، تم نے اس سے کام لیا اور اب اسے بے سہارا چھوڑ دیا۔ حکم دیا اس کا سارا خرچ بیت المال سے ادا کیا جائے۔‘‘ (وسائل الشیعہ، ج ۱۱ ص ۴۹) حضرت علیؑ تخت خلافت پر تشریف فرما ہیں، کسی نے خبر دی کہ ایک یہودی خاتون کے پیروں کی چھاگل، گلے کا ہار اور اس کے بُندے کسی مسلمان نے زبردستی چھین لئے ہیں، مولا علیؑ نے ارشاد فرمایا ایسے واقعات کے ردعمل میں اگر کوئی مسلمان اپنی جان بھی قربان کردے تو وہ قابل ملامت نہیں ہے، بلکہ ایسا واقعہ ہونے سے بہتر ہے کہ مسلمان اپنی جان دے دے (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۲۷) اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ’’ہرگز کسی کے غلام نہ بنو، جب کہ اللہ نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ (نہج البلاغہ، خط نمبر ۳۱ فقرہ نمبر ۳۴)

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) ۱۹؍نومبر ۲۰۱۰ء)

(۳)

۱۰؍دسمبر ۱۹۴۸ کو انجمن اقوام متحدہ کے تاریخی اجلاس میں تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ میں حقوق انسانی کا منشور منظور ہوا جس پر آج تک مغربی دنیا فخر کررہی ہے۔ منشور ایک مختصر سے مقدمہ اور 30 دفعات (آرٹیکلس) پر مشتمل ہے۔ مغرب کا دعویٰ ہے کہ ہم نے اس منشور کے ذریعہ کمزور، مظلوم اور ستم رسیدہ انسانوں کے حقوق کو محفوظ کردیا ہے اور انسانوں کے باہمی رشتوں، اخوت ومساوات کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کردیا ہے، لیکن قارئین کو معلوم ہے کہ آج تک اس منشور پر عمل نہیں ہوسکا ہے۔ آج بھی طاقتور کمزوروں کا استحصال کررہے ہیں، قوی ضعیفوں کو پیس رہے ہیں اور جنگل راج کا دور دورہ ہے۔ انجمن متحدہ آج تک نہ کسی مظلوم کو اس کا حق دلواسکی ہے اور نہ ابھی تک کسی ظالم کو سزا دلواسکی ہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ منشور میں مخلوق کے حقوق کا ذکر ہے مگر خالق کے حقوق کا کہیں تذکرہ نہیں۔ کوئی مخلوق اس وقت تک صحیح معنوں میں دوسری مخلوق کا حق ادا کرنے کے لائق نہیں ہوسکتی جب تک اپنے خالق کے حقوق ادا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ اسلام میں نظام حقوق بشر، اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف نازل شدہ شریعت میں مکمل یقین اور مستحکم ایمان کی بنیادوں پر ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق، رب، معبود اور قانون شریعت کا واضع مانتا ہے اس کے حقوق کی معرفت بھی رکھتا ہے اور حتی الامکان ان حقوق کی رعایت بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حفاظت کے لیے حتی المقدور کوشاں بھی ہے، ایسا ہی انسان دوسرے بندگان خدا کے حقوق کو درک بھی کرسکتا ہے اور ان کی مراعات بھی کرسکتا ہے، کیونکہ ایسا انسان یہ مستحکم عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق بشر ہے، تمام انسان اسی ایک اللہ کی مخلوق ہیں اس لئے سب کے حقوق برابر ہیں اور ان کی ادائیگی ہر انسان پر واجب ولازم ہے۔ یہی عقیدہ وحدت انسانی کی بنیاد بنا ہے۔ کیونکہ اللہ پر عقیدہ رکھنے والا جانتا ہے کہ رنگ ونسل وقومیت وجنسیت صرف شناخت کے وسیلے ہیں اور ان چیزوں کا رتبہ اور مقام سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر دنیا میں حقوق بشر کو منوانا ہے اور اخوت

ومساوات کا پرچم واقعتا بلند رکھنا ہے تو اللہ پر ایمان رکھنا ہوگا۔ اسلام کی تصدیق کرنا ہوگی، توحید پر تکیہ ہو، شریعت اسلامیہ پر اعتماد ہو تب کہیں جا کر حقوق بشر کی رعایت ہوسکتی ہے اور بندگان خدا کے درمیان مساوات قائم ہوسکتی ہے۔

اب تک کی جتنی بھی گفتگو تھی، وہ اقوام متحدہ کے منشور میں مندرج آرٹیکل ایک اور دو سے متعلق تھی، جن میں انسانی مساوات کا ذکر ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ یہ مساوات اسلام نے کہیں بہتر طریقے سے بہت پہلے عطا کردی ہے۔ آرٹیکل ۳رمیں حق حیات کے بارے میں گفتگو ہے۔ قرآن مجید میں بطور کلی حیات رحمت الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ کس طرح سے اس نے مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کیا۔'' (سورہ روم، آیت: ۵۰) اسی طرح قرآن مجید میں ایک مقام پر حیات انسانی کو ایسی روح کے ایک جز سے تشبیہ دی ہے ''جبکہ میں نے مٹی سے آدم کا پتلا تیار کیا اور اس میں اپنی روح کا ایک جز پھونکا'' (سورہ حجرات، آیت: ۱۵) اس طرح سے حیات، رحمت الٰہیہ کے مساوی ہے۔ اس رخ سے جہاں زندگی کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، وہاں یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ زندگی در اصل اللہ کی ایک امانت ہے جو ہمیں عطا کی گئی ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی پر صرف اتنا ہی اختیار ہے کہ جتنا زندگی بخشنے والے نے ہمیں عطا کیا ہے۔ فقہ اسلامی میں 'نفس محترمہ' کا بڑی شد و مد کے ساتھ تذکرہ اور ہر انسان کی جان قابل احترام ہے۔ قرآن مجید میں 'نفس محترمہ' کے عنوان کے تحت ہر انسان کی جان شامل ہے، چاہے وہ مسلمان ہو، چاہے نہ ہو۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید میں انسانی جان کا اتنا احترام ہے، منشور حقوق انسانی کی ترتیب دینے والے اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ قرآن مجید میں ایک انسان کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی بھی کسی کو بغیر قصاص اور زمین پر فساد پھیلانے کے جرم کے علاوہ بے گناہ قتل کرے تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کردیا اور اگر کسی ایک انسان کی جان بچائی تو گویا اس نے پوری انسانیت کو زندگی بخش دی۔ (سورہ مائدہ، آیت: ۳۳) مسلک شیعہ کی انتہائی اہم کتاب وسائل الشیعہ میں نفس محترمہ (قابل احترام انسانی زندگی) کے سلسلہ میں ۱۴؍احادیث موجود ہیں۔ اسلامی قانون کے تحت کسی کے قتل میں معاونت، بے توجہی، بے اتفاقی، یہاں تک کہ کسی قاتل کو پناہ دینا بھی حرام ہے۔ حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش ہونے والے مقدمات میں ایک مقدمہ تاریخ میں درج ہے کہ کسی شخص کا قتل ہوگیا، قاتل پکڑا گیا۔ حضرت علیؑ نے دریافت فرمایا کہ کیا وقت قتل کوئی ایسا شخص موجود تھا جو قاتل کو روک سکتا تھا اور مقتول کی جان بچا سکتا تھا۔ معلوم ہوا ایک غلام وہاں موجود تھا جو اتنی طاقت رکھتا تھا کہ قاتل کو روک سکے اور مقتول کی جان بچاسکے، مگر وہ دیکھتا رہا اور قتل ہوتا رہا اس نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ حضرت علیؑ نے حکم فرمایا قاتل سے قصاص لیا جائے گا اور اس شخص کی آنکھیں نکالی جائیں گی جو دیکھتا رہا، مگر مقتول کو بچایا نہیں۔ (بحوالہ 'حکومت علیؑ'، ناظم زادہ چاپ ایران) کیونکہ زندگی اللہ کی امانت ہے اور بندہ اتنا ہی اختیار رکھتا ہے، جتنا خالق نے عطا کیا ہے، اس لئے خودکشی حرام ہے، کیونکہ انسان امین ہے اور خودکشی امانت میں خیانت ہے۔ خودکشی کے سلسلہ میں دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ اکیلا جرم ہے جس میں ناکام رہنے پر سزا ہے، کامیاب ہوجانے پر کوئی سزا نہیں۔ اگر مجرم جرم میں کامیاب ہوجاتے تو پھر دنیا کا کوئی قانون اسے سزا نہیں دے سکتا۔ یہیں سے دنیاوی قوانین کی مجبوری اور اسلامی قوانین کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلام میں جرم کی اصلی سزا آخرت میں ملے گی۔ خودکشی میں کامیابی کی سزا دنیا کا قانون نہیں دے سکتا صرف آخرت ہی میں ایسے مجرم کو سزا مل سکتی ہے۔ (بشکریہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' (اردو) ۳؍دسمبر ۲۰۱۰ء)

(۴)

اسلام پر سخت ترین اعتراض ہے کہ وہ آزادی مذہب وعقیدہ کا مخالف ہے۔ مملکت اسلامیہ میں کسی کافر یا مشرک کا وجود

ناقابل برداشت ہے اور قرآنی حکم ہے کہ روئے زمین سے کفر و شرک کو زور زبردستی سے اکھاڑ پھینکو اور کسی کافر یا مشرک کو جہاں پاؤ قتل کردو۔ قدیم علماء میں بعض حضرات تکمیل عقیدہ کے قائل تھے اور ان کے دلائل حسب ذیل رہے ہیں (۱) اسلام یعنی جنت اور حیات ابدی، اور کفر وشرک یعنی جہنم اور ہلاکت ابدی، کیونکہ قرآن مجید کا فرمان ہے ''جس نے دین اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کیا تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں گھاٹا اٹھائے گا۔'' (سورہ آل عمران، آیت: ۸۵) لہٰذا مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اگر کوئی اپنی مرضی سے اسلام اختیار نہ کرے تو زبردستی اسے مسلمان بنایا جائے، کیونکہ یہ جبر اس کی بھلائی کے لئے ہے، تاکہ وہ جہنم سے نجات پائے اور بہشت کا حقدار ہوجائے (۲) اگر مسلمان خلاف اسلام عقائد کو زبردستی نہ مٹائیں تو وہ انسانی معاشرہ میں رواج پا جائیں گے اور ان کے ماننے والے بڑھ جائیں گے جس سے سادہ لوح مومنین بھی ان کے ساتھ ہوجائیں گے، لہٰذا ایسے ممکنہ خطرے سے بچنے کے لئے شرک وکفر کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہئے اور گمراہ کن عقائد کے پھیلانے والوں کو بھی ختم کردینا چاہئے تاکہ سادہ لوح مسلمان ان کے شر سے محفوظ رہیں (۳) انسانوں کی ایک بڑی تعداد نفس پرست اور ہوا و ہوس کی اسیر ہے۔ نفس پرستی کے سبب بہترین دلائل بھی اثر انداز نہیں ہوتے ہیں اور ہوس پرستی کے سبب بعض لوگ مذہب کی بہترین تعلیمات کے باوجود غلط عقائد کی طرف مائل ہوجاتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کے خلاف طاقت کا استعمال ضروری ہے (۴) عقیدہ توحید انسان کا بنیادی حق ہے، لہٰذا اس انسانی حق کا دفاع بھی انسانی حقوق میں داخل ہے اور اگر دفاع میں زور و جبر کا استعمال کرنا پڑے تو ہرگز قابل اعتراض نہیں۔

علماء کی اکثریت نے ان دلائل کو پسند نہیں کیا ہے اور ان دلائل کے مخالفین کا نظریہ ہے کہ ایمان واقعی کا تعلق قلب سے ہے اور ایمان کے لئے خلوص اور صمیمیت شرط ہے۔ چند جملوں کو زبان سے ادا کردینے سے کوئی مومن نہیں بن جاتا، جب تک اعتقاد نہ ہو۔ دین کا مقصد ایمان واقعی ہے نہ کہ ایمانِ ظاہری۔ ایمان واقعی اور اعتقاد قلبی زور و جبر سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ جبر کے نتیجہ میں نفاق اور ریا کاری تو ہوسکتی ہے جو کفر وشرک سے بدتر ہے۔ اس طرح زبردستی مومن بنانے سے مومن اور منافق کی تشخیص مشکل ہوجائے گی اور جو غرض ہے کہ جنت کے مستحق بن جاتے وہ بھی حاصل نہ ہو پائے گی، کیونکہ جنت مومنین واقعی کے لئے ہے منافقوں کے لئے نہیں۔ قرآن مجید کی بہ کثرت آیات اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں اور آیہ کریمہ **''لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی''** اس سلسلہ میں بنیادی حقیقت رکھتی ہے۔ ترجمہ: ''دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے، جب کہ ہدایت گمراہی سے ظاہر ہوچکی ہے'' (سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۶) دراصل دین میں جبر ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ دین کا تعلق دل سے ہے۔ اسی طرح سے اسلام میں جتنی بھی عبادتیں ہیں ان میں نیت شرط ہے اور نیت دل میں ہوتی ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی۔ جب تک نیت نہ ہو نماز نہیں ہوسکتی۔ روزہ کے لئے نیت شرط، بغیر نیت روزہ نہیں ہوسکتا، بغیر نیت کے حج نہیں ہوسکتا۔ ظاہری عمل تو زبردستی انجام دلوایا جاسکتا ہے، مگر زبردستی نیت نہیں کروائی جاسکتی، دوسرے لفظوں میں جبر سے اٹھا بیٹھی تو کروائی جاسکتی ہے، زبردستی نماز نہیں پڑھوائی جاسکتی۔ زبردستی فاقہ تو کروایا جاسکتا ہے روزہ نہیں رکھوایا جاسکتا۔ بذریعہ جبر مکہ مکرمہ کے سفر پر تو بھیجا جاسکتا ہے، حج نہیں کروایا جاسکتا۔ بالفاظ دیگر جبر کے ذریعہ منافق تو بنوایا جاسکتا ہے مومن نہیں۔ ایک مقام پر قرآن کریم میں ارشاد ہے، ترجمہ: ''ہم نے اس کو اچھی اور بری دونوں راہیں دکھلا دی۔ (سورہ بلد، آیت: ۱۰) ایک جگہ اعلان ہورہا ہے ''سچی بات تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوچکی ہے بس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے'' (سورہ کہف، آیت: ۲۹) یعنی انتخاب میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اپنے اختیار اور ارادے سے صحیح یا غلط کا انتخاب کرے۔ یہاں تک کہ انسانوں کی تقدیر کو بھی اس کے اعمال سے وابستہ فرما دیا ''اللہ کسی قوم کی حالت اس

وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلے''۔ (سورہ انفال، آیت: ۵۳) اس طرح آزادی اور اختیار کو انسان کی خلقت کی اساس قرار دیا گیا ہے، ''پس ہم نے برائیاں اور اچھائیاں اسے الہام کر دیں'' (سورہ شمس، آیت: ۸) اگر اللہ چاہتا تو سب ہدایت یافتہ ہوجاتے۔

''اگر تیرا اللہ چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ سب کے سب باایمان ہوجائیں'' (سورہ یونس، آیت: ۹۹) ان تمام آیات سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ انسان بااختیار اور اپنے ارادہ میں آزاد رہے اور آزادی واختیار دینا سنت الٰہیہ ہے۔ مذکورہ بالا آخری آیت کے سلسلے میں عباسی خلیفہ مامون الرشید نے حضرت امام رضا سے سوال کیا تو امامؑ رضا نے اپنے جد حضرت علیؑ کے حوالہ سے نقل فرمایا کہ بعض مسلمانوں نے رسول اکرمؐ سے کہا کہ آپ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں تو ہماری تعداد میں اضافہ ہو اور قدرت وطاقت میں بھی۔ رسول اکرمؐ نے جواب میں فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ ایسی بدعت انجام دینے کے بعد اللہ سے ملاقات کروں کہ جس بات کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور میں سختی کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس گفتگو کے بعد یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ اسی طرح سے آیت کریمہ ''لا اکراہ فی الدین'' کی شان نزول کے سلسلے میں علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں تحریر فرمایا ہے کہ انصار میں سے ایک شخص ابوحصین تھا، جس کے دو بیٹے تھے۔ ملک شام سے ایک زیتون فروش آیا کرتا تھا، اس نے کسی طرح سے ان دونوں کو عیسائی مذہب کی طرف راغب کرلیا اور اپنے ساتھ شام (سیریا) لیتا گیا۔ ابوحصین نے سارا ماجرا رسول اکرمؐ سے بیان کیا اور چاہا کہ اس کے بیٹوں کو زبردستی واپس لایا جائے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ''دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے''۔

اگر قرآن مجید کی صرف ایک آیت کو پیش کر دیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ مخالفین کے اعتراضات کا سارا قلعہ منہدم کردینے کے لئے کافی ہے۔ ''(اے رسولؐ) اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی امن کی جگہ واپس پہنچا دو'' (سورہ توبہ، آیت: ۶) آیۂ کریمہ بہت سے نکات پر روشنی ڈالتی ہے (۱) تحقیق کا راستہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے۔ کوئی بھی شخص کسی بھی عقیدہ کا کیوں نہ ہو، اگر تحقیق کا جویا ہے تو اسے آزادانہ جستجو کے سارے مواقع فراہم کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے (۲) تحقیق کے دوران اسے مکمل آزادی کے ساتھ پوری حفاظت کی ذمہ داری بھی مسلمانوں کی ہے۔ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اور پرامن ماحول فراہم کیا جائے (۳) تحقیق کے بعد نتیجہ تحقیق جو بھی ہو، کسی مسلمان کو حق نہیں کہ اس مشرک پر اپنا نظریہ زبردستی تھوپنے کی کوشش کرے (۴) اس مشرک کے دلائل انتہائی صبر وسکون سے سنے جائیں اور مسلمان اسلام کی حقانیت کے دلائل اور براہین اس کے سامنے پیش کریں اور اسے پورا موقع فراہم کیا جائے کہ شناخت کامل کے بعد وہ حق کو قبول کرے اور اپنی مرضی اور ارادے سے باطل کو ترک کرے (۵) جب وہ کہہ دے کہ میری تحقیق مکمل ہوگئی ہے تو اس کے بعد بھی مسلمانوں کو نتیجہ تحقیق پوچھنے کا اختیار نہیں ہے، بلکہ پہلے اسے ایسی جگہ پہنچایا جائے، جہاں اسے امنیت کا پورا یقین ہوتا کہ وہ وہاں اپنے عقیدہ کا آزادانہ اظہار کرسکے۔ معترضین کے سارے اعتراضات ایک طرف یہ آیۂ کریمہ ایک طرف۔ یہ آیۂ کریمہ کیا ہے مولیٰ علیؑ کی ذوالفقار ہے جو دشمنوں کے سارے حملوں کو تنہا پسپا کرنے کے لئے کافی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' (اردو) ۱۳؍دسمبر ۲۰۱۰ء)

